اُردو کا ایک معتوب ناولٹ- گُرگِ شب

لیاقت علی*

Abstract:

Ikram-Ullah is included among renowned but somewhat neglected fiction writer of Urdu. His first Novel "Gurg-e-Shab" encircles a topic, rebelling the current values of society which wasn't acceptable for the then government. However, This Novel was banned due to the description about human sexual psychology and some butter sentences and in future, its publication was banned. This article is to introduce this important psychological novel and indicates strong grip of the writer on the topic and its description. This condemned Novel of Urdu is not within the range of a common reader and this is the demand of the present era that this novel should be re-published.

اُردو فکشن کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو اپنے عہد کے مروجہ سیاسی، سماجی، اخلاقی یا مذہبی تصورات سے متصادم ایسے بہت سے موضوعات یا بیان کے حصے تلاش کئے جا سکتے ہیں جن کی بدولت بعض افسانے، افسانوی مجموعے یا ناول حکومتِ وقت نے ضبط کئے اور اُن کی آئندہ اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بات یہیں تک نہ رہی بلکہ اِن کہانیوں کی تخلیق کے جرم میں تخلیق کاروں کو سیاسی، سماجی یا مذہبی حلقوں کے کڑے ردِ عمل اور حکومتی حلقوں کی

* استاد شعبۂ اُردو و اقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

جانب سے قید و بند کی صعوبتوں کو بھی جھیلنا پڑا۔ یہ سوال اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے کہ تخلیق کار موضوعات کے انتخاب میں کس قدر تخلیقی آزادی کا متحمل ہوسکتا ہے؟ نیز لکھنے والے کو محض اُنہی موضوعات تک محدود رہنا چاہیے جو ہمارے سماجی، مذہبی یا ریاستی حلقوں سے قبولیت کی سند حاصل کرسکیں یا وہ یہ حق رکھتا ہے کہ ان حلقوں کے لئے ناپسندیدہ مگر انسانی نفسیات کے قریب تر ایسے موضوعات کو بھی پیش کرے جن سے بالعموم گریز برتا جاتا ہے؟ عرفِ عام میں حسّاس قرار دیے جانے والے یہ موضوعات ہماری مذہبی یا جبلی زندگی سے بحث کرتے ہیں جن کے بیان میں مصنّفین بسا اوقات سماجی یا مذہبی دباؤ میں حقیقی صورتحال پر مثالی تصورات کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن کبھی صورتحال اِس کے برعکس ہوجائے تو بہت سے مسائل بھی جنم لیتے ہیں اور یوں تخلیقی آزادی اپنی جگہ ایک سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔

اِس ضمن میں مغربی مصنّفین کو بہر حال وہ تخلیق آزادی میسر ہے جو کسی بھی تخلیق کار کی خواہش ہوسکتی ہے، لیکن برصغیر کے مصنّفین اپنی مخصوص ثقافتی اور مذہبی تاریخ میں ترتیب پانے والی جذباتی زندگی کے باعث خود کو بہت سے موضوعات کی پیشکش کے حوالے سے مجبور پاتے ہیں۔ 1932ء میں چار افسانہ نویسوں (سجاد ظہیر، رشید جہاں، محمود الظفر، احمد علی) کے مشترکہ افسانوی مجموعے ''انگارے'' کی اشاعت اور پھر اپنے باغیانہ موضوعات کے باعث ضبطی سے لے کر سعادت حسن منٹو یا عصمت چغتائی کی بعض کہانیوں پر دائر کئے جانے والے مقدمات تک، ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو تخلیقی آزادی پر سوالیہ نشان ڈالتی ہیں۔ یہی نہیں پاکستان میں دو ادوارِ آمریت بھی ایسی بہت سی مثالیں پیش کرتے ہیں جہاں مروجہ سیاسی نظامِ حکومت کے خلاف لکھی جانے والی بے شمار تحریروں کو سنسر کی کڑی پابندیوں اور تخلیق کاروں کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ ملکی تاریخ کے دوسرے مارشل لاء کے ابتدائی برسوں میں منظرِ عام پر آنے والا ناول ''گُرگِ شب'' بھی ایسا ہی ایک ناول ہے جسے مروجہ سیاسی، سماجی یا اخلاقی نظام کی خلاف ورزی کی پاداش میں ضبط کرلیا گیا۔ یہ اہم مگر معتوب ناول عہد جدید کے معتبر مگر کسی قدر نظر انداز کئے جانے والے مصنف اکرام اللہ نے تحریر کیا۔ ناول کا ایک باب کتابی شکل میں آنے سے پہلے سلیم الرحمٰن کے نامور ادبی جریدے 'سویرا' میں ''سُپن بھکاری'' کے عنوان سے شائع ہوا۔[۱] بعد ازاں 1978ء میں اسے پاکستان کے نامور اشاعتی ادارے سنگ میل نے شائع کیا۔ ناول اگرچہ اپنی ضخامت اور موضوعاتی تحدید کے باعث ناولٹ بھی قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن مصنف نے اِسے بطور ناول ہی پیش کیا ہے۔ اکرام اللہ کے مجموعی افسانوی سرمائے پر نظر دوڑائی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ناولٹ ایسی صنف ہے جس میں انہیں کمال دسترس حاصل ہے اور اگر وہ ''گُرگِ شب'' کو ناول ہی کہنے پر مُصر نہ ہوں تو اسے بھی ایک کامیاب ناولٹ قرار دیا جاسکتا ہے۔ بقول ریاض احمد:

''اکرام اللہ کے ناولوں میں بالعموم بڑی یکسوئی اور دردمندی سے اُن مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے جن کے حل نہ ہونے سے ہمارا معاشرہ روز افزوں ابتری کا شکار ہے''۔[۲]

ناول اور ناولٹ کی تقسیم کن بنیادوں پر ہوسکتی ہے اِس ضمن میں مختلف ناقدین کی آراء مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن فی الوقت یہ مقالہ اِس بحث کا متحمل نہیں ہوسکتا اِس لئے ہمیں اپنے موضوع کی طرف پلٹنا چاہیے۔ ''گُرگِ شب'' کے مصنف اکرام اللہ کا شمار اُردو کے ایسے افسانوی نثر نگاروں میں کیا جاسکتا ہے جنہیں اپنی بھرپور فنی پختگی اور عمدہ تخلیقی نثر کے باوجود تنقیدی روایت میں خاطر خواہ توجہ کے لائق نہیں سمجھا گیا۔ ایک اہم مصنف کو نظر انداز کئے جانے کے کئی اسباب میں سے ایک خود اُن کا مجلسی زندگی سے گریز اور اپنی کتابوں پر ناقدین کی آراء یا تعارفی تقاریب سے اجتناب بھی ہے۔ میری اِس بات کی تائید اُن کی تمام افسانوی کتب دیتی ہیں جن میں سے کسی ایک میں بھی مصنف نے رسمی یا غیر رسمی دیباچے میں اپنے نظریہ فن یا افسانوی موضوعات سے متعلق کوئی وضاحت مناسب نہیں سمجھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''جنگل'' کے آغاز میں شامل ڈاکٹر سلیم اختر کے ایک تعارفی مضمون اور ''گرُگِ شب'' پر خالد اختر کے تحریر کئے گئے فلیپ کے علاوہ کسی ناول، افسانوی مجموعے یا ناولٹ پر کسی ناقد کی کوئی رائے شامل نہیں کی گئی۔[۳] اپنے عہد کے مروجہ دستور سے مصنف کا یہ اجتناب اِس بات کا شاہد ہے کہ موضوعات کے انتخاب اور پیش کش میں بھی وہ کسی روایتی دستور یا ضابطوں کے پابند نہیں ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اِس کا سبب کچھ اِن الفاظ میں بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں:

''وقت اکرام اللہ سے جو بے اعتنائی کر رہا تھا وہ اس سے غافل نہیں تھا۔۔۔ یہ خیال اُس کے دِل پر آ کاش بیل کی طرح پھیل گیا تھا کہ اُس نے اُردو ناول اور افسانے میں جو تجربے کئے ہیں شاید اُن کی کوئی اہمیت نہیں۔ چنانچہ اکرام اللہ آہستہ آہستہ ادب سے بے گانہ ہونے لگا۔ اُس نے ناول لکھنا شروع کیا لیکن پھر اُسے اُٹھا کر طاق میں رکھ دیا۔ افسانہ تخلیق کیا لیکن اُسے اشاعت کے لئے بھیجنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ میں اگر یہ کہوں کہ اکرام اللہ آج بھی اُردو ادب کا (Out sider) ہے تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔ بلاشبہ وہ ابھی پابۂ گِل ہے اور اُس کی شاخوں کا چھتنار پھیلا ہوا ہے۔ لیکن وہ اے۔ آر۔ خاتون اور ایم۔ اسلم جیسا مقبول مصنف نہیں۔ اکرام اللہ تو ادب کا (Odd Man out) ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ اپنے زمانے کے مقبول ترین مصنف تو اس وقت کی ایک لہر کے ساتھ ہی معدوم ہو جاتے ہیں لیکن کسی (Odd Man out) کو پہچاننے کے لئے زمانہ اُلٹے پاؤں سفر کرتا ہے اور مستقبل اس کے قدموں کی چاپ پر ہی آگے بڑھتا ہے''۔[۴]

ڈاکٹر انور سدید کی اِس رائے کے آخری پیراگراف سے تو اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ مقبول ادب اور بڑا ادب ضروری نہیں ایک ہوں۔ بلکہ بیشتر اپنے عہد کا مقبول ادب وقت کی گرد میں تمام تر مقبولیتِ سمیت چھپ جاتا

ہےاور بڑا ادب ہر عہد کے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس اقتباس میں ناول کو اُٹھا کر طاق میں رکھنے اور افسانہ تخلیق کرنے کے باوجود اشاعت کے لئے نہ بھیجنے کے جس رویے کی نشاندہی کی ہے وہ درست نہیں، کیونکہ اکرام اللہ کے افسانے اور ناولٹ تواتر سے اُردو کے نامور ادبی جرائد (سویرا، فنون، آج) میں شائع ہوتے رہے ہیں۔تاہم مجھے ڈاکٹر انور سدید کی اِس بات سے اتفاق ہے کہ اکرام اللہ نے مقبول افسانوی نثر لکھنے پر معیاری کہانیاں لکھنے کو ترجیح دی اور پھر مختلف تقریبات، مضامین یا انٹرویوز کے ذریعے خود کو منوانے کے بجائے یہ فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا کہ وہ اِس سرمائے کو کس معیار پر پرکھتا ہے۔

اگرچہ اُنھوں نے اپنے نظریۂ فن کی وضاحت کہیں نہیں کی اور نہ ہی وہ عملی طور پر کسی ادبی تحریک سے وابستہ رہے ہیں تاہم اُن کے مجموعی افسانوی سرمائے کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے کہ بیدار شعور کے ایسے روشن خیال تخلیق کار ہیں جو اپنی سماجی زندگی کے تضادات اور اُن کے محرکات کو جانتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں اور اُلجھی ہوئی جبلی اور سماجی زندگی کا باریک بین مشاہدہ بھی رکھتے ہیں۔ان کے کردار عصری صورت حال سے نبرد آزما انسان کے عمل اور ردِ عمل کی عمدہ اور قرینِ قیاس عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔اُن کا فنی اختصاص یہ ہے کہ ایک گہرا سماجی اور ترقی پسندانہ شعور رکھنے کے باوجود ان کی کہانیاں کسی سماجی نعرے یا تبلیغ کا کام نہیں کرتیں بلکہ عین تخلیق رہ کر قاری کو متاثر کرتی ہیں۔بقول مجتبیٰ حسین:

> ''افسانوی ادب میں نظریے کرداروں کے منہ میں رکھ نہیں دیے جاتے بلکہ ماحول اور مواقع کا تقاضا کرداروں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے افکار و نظریات کا اظہار کریں۔کوئی نقطۂ نظر زبردستی کسی کردار کی زبان سے کہلوایا نہیں جاتا۔اچھا ادب اس سماج اور سماجی ذہنیت کو پیش کرتا ہے جس کے ماتحت کردار موجود ہیں''۔[۵]

اِسی طرح انسانی حیات کی نفسیاتی و سماجی زندگی کے گہرے مطالعے کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''افسانوی ادب کی تخلیق کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ حیاتِ انسانی کا گہرا مطالعہ کریں اور فن کی ضرورت پر نظر رکھتے ہوئے ایسے افسانے لکھیں جن سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی نفسیاتی اور سماجی زندگی کے راز کُھلیں۔کل ایسے ہی کارناموں کا شمار ادبِ عالیہ میں ہوگا''۔[۶]

زیرِ مطالعہ ناول ''گُرگِ شب'' بھی اِس امتزاج کا عمدہ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے جسے احتشام حسین ادبِ عالیہ کی شرط قرار دے رہے ہیں۔اگرچہ ناول کا موضوع ہمارے مروجہ اخلاقی، سماجی یا ریاستی مزاج کو گوارہ نہیں لیکن مصنف اِس ضمن میں اُس تخلیق آزادی اور جرأت کا مظاہرہ کرتا ہے جو اُردو فکشن میں کم کم ہی نظر آتی ہے۔بقول

ریاض احمد:

''اکرام اللہ کے ناول ''گُرگِ شب'' پر آج سے بہت پہلے حکومت نے پابندی لگا دی تھی۔ یہ ثبوت ہے کہ اُن کا لکھا ملک کے بالا دست طبقے کی نظر میں کھٹکتا ہے'' ۔[۷]

اکرام اللہ کی یہ وابستگی نظریاتی وابستگی ہی کو نہیں فنی مہارت کو بھی ظاہر کرتی ہے جہاں وہ کرداروں کو اپنی مرضی یا بالا دست طبقے کی منشا میں ڈھالنے کی بجائے آزادی دیتے ہیں کہ وہ اُس عمل اور ردِعمل کو ظاہر کریں جو صورت حال کا تقاضا بھی ہے اور تخلیقی ذمہ داری بھی۔ یوں یہ کام وہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ کیا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''فنی طور پر اکرام اللہ کی ایک ایسا افسانہ نگار ہے جو حقیقت کو صورتِ واقعہ سے اور کردار کی جزئیات سے اُبھارتا ہے۔ اُس کے افسانوں میں جو خاکی انسان نمودار ہوتا ہے وہ نہ نوری ہے نا ناری۔ وہ غیر مثالی اور غیر معمولی انسان نہیں۔ اُس کا خمیر گناہ اور ثواب کے امتزاج سے اُٹھایا گیا ہے۔''[۸]

اُن کی انہی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف اپنے عصر کے نمائندہ تخلیق کار محمد خالد اختر کے اِن الفاظ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں وہ بے ساختہ انہیں داد دیتے نظر آتے ہیں۔

''اکرام اللہ حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔ میں فی الواقع اتنی جدت طرازی، درد مندی اور ندارتِ بیان دیکھ کر جن کی یہ کہانیاں حامل ہیں، مبہوت اور بے حد خوش ہوں۔ پڑھنے والے جو اُردو مختصر افسانے کی رواجی ساخت اور اس کی یک رنگی سے اُکتا کر اسے پڑھنا چھوڑ چکے ہیں اِن کہانیوں کو پڑھ کر خوشگوار طور پر متعجب ہوں گے۔ انہیں اس امر کا احساس ہوگا کہ ایک بالیاقت فنکار ہمیشہ اس اہم ادبی صنف کو ایک نیا موڑ ایک انوکھا رُخ عطا کر سکتا ہے'' ۔[۹]

ناقدین کی مندرجہ بالا آراء کی روشنی میں اگر ہم اُن کے ناول ''گرُگِ شب'' کا مطالعہ کریں تو ہمیں دکھائی دے گا کہ یہ ناول انسان کی سماجی، مذہبی اور اخلاقی زندگی سے جنم لینے والی اُن نفسیاتی پیچیدگیوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جو سماجی توقع اور مذہبی دباؤ کی وجہ سے فرد کو ابنارمل بنا دیتی ہیں۔

ناول بنیادی طور پر یک کرداری ناول ہے جو مرکزی کردار شفیع کی جنسی طاقت سے محرومی سے جنم لینے والی نفسیاتی پیچیدگیوں کا احوال لئے ہوئے ہے۔ شفیع کی یہ محرومی پیدائشی یا فطری نہیں بلکہ لڑکپن اور جوانی میں ہونے والے اِس انکشاف کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے باپ نہیں بلکہ سوتیلے بھائی کی اولاد ہے۔ حرامی ہونے کا یہ احساس اور اپنے سوتیلے بھائی اور والدہ کے اِس تعلق کا انکشاف اِس کردار سے اُس کی جنسی قوت سلب کر لیتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ

انکشاف اُسے اُس لمحے جنسی قوت سے محروم کر دیتا ہے جب وہ اِس کے لئے مکمل طور پر تیار ہوتا ہے۔ یوں یہ انکشاف ایک صدمے کی صورت مستقل جنسی گریز کی حسب اختیار کر لیتا ہے جس سے وہ تمام عمر چھٹکارہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اپنی محبوبہ حمیدہ کے منہ سے عین لمحۂ وصال میں اِس استفسار کے بعد کہ تم بھائی غلام احمد کے بیٹے ہو؟ سے پہلے تک شفیع خود کو ایک نارمل مرد ہی پاتا ہے۔

''ہم گاہے گاہے وہاں ملنے لگے لیکن اپنی محبت کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک رکھنے کے عہد پر قائم رہے۔ ایک شب میرے جسمانی تقاضوں کے سامنے اس عہد کے قائم رہنے کا کوئی امکان نہ تھا کہ حمیدہ نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر نہایت محبت' انکساری اور پیار سے کہا۔ ''شفیع ایک بات پوچھوں بُرا تو نہ مانو گے''؟

میرے کان کھڑے ہوئے، میرے دل میں بیٹھے چور نے پہلو بدلا۔ ''تم کوئی بات پوچھو اور میں بُرا مانوں یہ کیسے ہو سکتا ہے''؟

''میری ماں کہتی تھی'۔۔۔۔'' ہاں ہاں کہو رُک کیوں گئیں''، ''میری ماں کہتی تھی کہ تم بھائی غلام احمد کے بیٹے ہو۔ مَیں شل ہو گیا۔ میرا جوش، جذبہ اور انگیخت سب اس طرح سرد ہو گئے جیسے میرے بدن میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے''۔ [۱۰]

مذکورہ بالا اقتباس یہ واضح کرتا ہے کہ شفیع کے یہاں جنسی طاقت سے محرومی کوئی فطری امر نہیں بلکہ اُس احساس ندامت اور نفسیاتی دباؤ کا نتیجہ ہے جسے مروجہ سماجی یا مذہبی نظام سے قبولیت حاصل نہیں۔ یوں اِس لمحے شفیع کا یہ جنسی گریز مستقل صورت اختیار کر لیتا ہے جس کی شدت میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ ناول کے اختتام تک اس سے نجات پانے کے لئے کوشاں نظر آتا ہے۔ اِس احساس کو مستقل صورت دینے میں وہ منظر بھی اہم کردار ادا کرتا ہے جب وہ اپنی محبوبہ حمیدیہ کو ایک اور لڑکے نذیر سے ہم بستری کرتے دیکھتا اور اپنا ذکر ایک کاٹ دار طنزیہ جملے میں سنتا ہے۔

''اچھا وہ حرامی! ہاہاہاہا'' حمیدہ نے کھلکھلا کے آتی ہوئی ہنسی کو پکڑے جانے کے ڈر سے سینے میں دبا لیا۔ ''وہ مجھے کیا گھورے گا وہ تو خود لڑکی ہے۔'' [گُرگِ شب، ص ۴۸]

شفیع کے لئے حرامی ہونے کی یہ ہزیمت ایسے مستقل جنسی گریز کا سبب بن جاتی ہے جو اُسے ایک نفسیاتی مریض بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی اِس شناخت سے چھٹکارہ پانے کے لئے گاؤں چھوڑ دیتا ہے، سبھی رشتوں ناطوں سے الگ ہو کر ایک کامیاب تاجر کی صورت سماجی برتری میں اس احساسِ کمتری کو دبانا چاہتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔

وہ اُس بدن کی عملی تصدیق چاہتا ہے جسے بطور مرد خلق کیا گیا ہے۔ لیکن بدن اس تصدیق سے قاصر نظر آتا

ہے۔ شفیع کے اندر یہ احساس جس نوع کے داخلی اور خارجی نفسیاتی عوارض کو جنم دیتا ہے وہ ناول کے بیشتر صفحات پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ کہیں خود کلامی کی صورت تو کہیں خواب کی شکل میں۔ کہیں کسی بے بس لمحے کو یاد کر کے تو کہیں خارجی منظر سے ایک مختلف تاثر کشید کرتے ہوئے جنسی محرومی اور ذلت کا یہ احساس شفیع کو تمام عمر ایک عذاب میں مبتلا رکھتا ہے۔ ذلت کے اس احساس کی مختلف صورتیں ذیل میں درج اقتباسات میں دیکھیے۔

''بدن نہ ہو تو جذبات واحساسات کا کوئی وجود نہ ہو۔ ہم بدن ہیں اور بدن ہم میں۔ سمندر کی طرح اتھاہ، وسیع، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے جذبات اپنا بدن قبول کروا کے اور دوسرے کا بدن قبول کر کے اظہار اور تسکین کی راہ پاتے ہیں۔ ہم کس طرح پکارتے ہیں چیختے ہیں کہ ہمارا بدن قبول کر لو۔ کس طرح تڑپتے ہیں، پھڑکتے ہیں کہ دوسرا اپنا بدن ہمیں سونپ دے۔ محبوب کو اپنے اندر لپٹا کے جذب کر لینا چاہتے ہیں اور خود اُس کے اندر جذب ہو جانا چاہتے ہیں۔ لیکن جو بدن اس سب پکار، چیخ، تڑپ، پھڑک رکھنے کے باوجود نہ اپنا بدن قبول کروا سکتا ہو نہ دوسرا بدن قبول کر سکتا ہو تو وہ کیا کرے؟ بدن واپس کر دے۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ یہ بہتان ہے کہ میں دوسرا بدن قبول نہیں کر سکتا۔''

[گُرگِ شب، ص۴۰]

''وقت گزارنے کا ایک اچھا طریقہ عورت بھی ہو سکتی ہے چاہے کرائے کی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم اپنے بھائی کے بیٹے ہو کہ باپ کے تو کیا جواب دوں گا۔'' [گُرگِ شب، ص۵۵]

''ریحانہ نے اپنا سانولہ سلونا کتابی چہرہ ہتھیلیوں پر رکھ کر ایک لمبی سانس لیتے ہوئے نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔۔۔۔ اس نے دُکھ بھرے راز دارانہ لہجے میں کہا۔ شفیع صاحب ایک بات پوچھوں؟ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ماتھے پر کہیں سے پسینہ آ گیا۔ نشہ جیسے کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ پہلے بھی کسی نے اس محبت اور لجاجت سے ایک بات پوچھنے کی اجازت چاہی تھی۔ ریحانہ کو کہاں سے پتہ چل گیا کہ میں اپنے باپ کا نہیں بھائی کا بیٹا ہوں''۔[گُرگِ شب، ص۷۹]

اور تو اور شفیع کا یہ احساس کمتری انگڑائی لیتے کتے کو دیکھ کر یہی اس سوال سامنے لے آتا ہے۔

''جیکی نے پوری زبان باہر نکال کر اس کا لام سا بناتے ہوئے جمائی لی اور ڈنڈ نکالنے کے انداز میں انگڑائی لی اور دُم ہلاتے ہوئے میرا منہ دیکھنے لگا۔ معاً میرے ہونٹوں پر کہیں سے ایک سوال آ گیا۔ جیکی کہیں تو بھی اپنے بڑے بھائی کا بیٹا تو نہیں؟''

[گُرگِ شب، ص۷۰]

اِسی طرح شفیع اپنے دوست کی بیوی ریحانہ کو جنسی اختلاط پر آمادہ کر کے اپنے بستر تک تو لے آتا ہے لیکن

وہاں بھی جنسی طاقت سے محرومی ایک مرتبہ پھر اُسے شرمندہ کر دیتی ہے۔

''ریحانہ کا ہاتھ میرے برہنہ بدن پر بھٹکتا پھر رہا تھا۔ وہ ننھا ہاتھ صحرا جتنے بڑے اور صحرا جیسے بنجر جسم کے ہر ذرے پر ہمہ وقت موجود اُنہیں کُریدر ہا تھا۔ میرے خون کے اندر اب کچھ باقی نہ بچا تھا۔ زندگی کی دلیل صرف مایوسی تھی۔۔۔۔ریحانہ کا ازل سے تشنہ بدن پانی کے انتظار میں تاب نہ لاتے ہوئے آخر چِل بسا اور اُس نے آنکھیں کھول دیں اور نہایت بوجھل آواز میں کہا۔''آپ پھر تھوڑی سی شراب ہی پی کر دیکھ لیں''۔ میں یہ کہتے ہوئے پلنگ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔نہیں بے کار ہے''۔[گُرگِ شب،ص۱۳۹]

اِس طرح شفیع اپنی زندگی میں اعتبار حاصل کرنے اور اپنے احساسِ محرومی سے نکلنے کے لئے جن دو تصورات کو مثالی بنا کر رشک اور حسرت سے بیان کرتا ہے وہ بھی قابلِ غور ہیں۔

''میرے سب سے زیادہ محبوب دو تصورات ہوتے تھے۔ایک تو یہ کہ مجھے اپنی ماں کے علاوہ کسی بھی اور عورت نے جنم دیا تھا اور دوسرا یہ کہ حمیدہ کا جنسی ساتھی نذیر نہیں میں تھا۔''[گُرگِ شب،ص۱۰۱]

اِن دو تصورات کے پیچھے دراصل اپنی موجود شناخت کو ختم کرنے کی خواہش ہے جس نے شفیع کی جنسی ہی نہیں سماجی زندگی کو بھی متاثر کر رکھا ہے۔ اپنی اِس محرومی سے نکلنے کے لئے وہ ہر ممکن جتن کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے میں اُسے ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ ممکن ہے اُس کا یہ جنسی گریز شناسائی کے احساس کی بدولت اُس پر غالب آجاتا ہو اور اگر اس کا جنسی ساتھی اُس سے کسی طرح کی شناسائی نہ رکھتا ہو تو ممکن ہے اُس کے یہاں یہ محرومی نہ رہے؟ یہ خیال اُسے تحریک دیتا ہے کہ کیوں نہ کسی طوائف کے ساتھ وقت گزارے۔

''سوچا تھا ناواقف عورت (جس سے پھر کبھی دوچار ہونے کا امکان نہیں) کے سامنے ناکامی اور مستقل شرمندگی کا خوف بھی اتنا شدید نہیں ہوگا اور ممکن ہے یوں میرا اقدم تعاون پر مُصر ذہن میرے جسم کے ساتھ اشتراکِ عمل پر آمادہ ہو جائے۔''

[گُرگِ شب،ص۱۵۷۔۱۵۸]

لیکن پھر اِس منصوبے کی تکمیل سے پہلے اُس کے حواس پر طاری خوف سراب کو حقیقت میں بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور نتیجتاً وہ اس منصوبے کو بھی ترک کر دیتا ہے۔

''یہ دَلّا بتائے بغیر مجھے کسی خفیہ راستے سے شیر علی کی حویلی میں لے آیا ہے اور خود حمیدہ کو بلانے گیا ہے کہ وہ آ کر مجھے بتائے کہ میں اپنے باپ کا نہیں بھائی کا بیٹا ہوں۔حمیدہ کے آنے سے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''[گُرگِ شب،ص۱۶۰]

اپنی نامردی کا احساس اِس کردار کے حواس پہ اس حد تک طاری ہے کہ شہر کی صفائی ہوتے دیکھ کر بھی اُسے جو خیال آتا ہے وہ یہی ہے۔

''شہر کی نوک پلک درست کی جا رہی تھی گویا وہ بھی میری طرح کوئی فاتر العقل عورت ہو جسے تھوڑی دیر میں کسی نامرد شخص کے سامنے جنسی اختلاط کے لئے پیش کرنا ہو۔''

[گُرگِ شب، ص ۱۶۷]

اِس کردار کی یہ ذہنی اور نفسیاتی حالت بالآخر اسے پاگل پن کی حدوں تک لے آتی ہے اور اُسے دیوانگی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ ایسے میں اُس کی حرکات کا بیان ملازم کی زبانی اُسے یوں معلوم ہوتا ہے۔

''مَیں نے کہا آپ شیشے پر زیادہ چہرہ نہ رگڑیں پہلے ہی سُرخ ہو رہا ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ تم دیکھ نہیں رہے میرے چہرے پر اتنی بہت ساری کالک تھپی ہوئی ہے اُسے اتار رہا ہوں۔''[گُرگِ شب، ص ۱۷۳]

'' آپ نے کہنا شروع کیا اِس شہر میں کہیں سے ایک دیہاتی عورت آ گئی ہے وہ ایسے ہی غلط ملط باتیں کہتی ہے۔ وہ میری ماں نہیں۔ جیسے حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ نہیں تھا ویسے ہی میری کوئی ماں نہیں تھی۔''[گُرگِ شب، ص ۱۷۴]

یہ چند اقتباسات دراصل مرکزی کردار کی اپنی شناخت سے عدم مفاہمت کی نشاندہی کر رہے ہیں جسے مٹانے کے لئے وہ اپنے گاؤں سے شہر آتا ہے، اپنی سابقہ شناخت کا ہر حوالہ مٹا دینا چاہتا ہے لیکن یہ احساس اُسے ہمیشہ اذیت میں مبتلا رکھتا ہے کہ وہ ایک ایسی عورت کا بیٹا کیوں ہے جس نے اپنے سوتیلے بیٹے سے مل کر اُسے پیدا کیا۔ بقول محمد خالد اختر:

''گُرگِ شب ایک ایسے اُلجھے ہوئے، دراڑ پڑے شخص کی کہانی ہے جو ایک Incest کے رشتے سے اس دنیا میں آیا ہے اور اب اپنی ذہنی گرہوں کی وجہ سے اپنی شرم اور نفسیاتی رکاوٹوں کی دیوار پھاند کر ایک عام اور اوسط آدمی کی ذہنی اور جسمانی زندگی کا حاصل کرنا اُس کے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔ وہ اس جنسی اور جذباتی محرومی کے ہولناک خلا کو پُر کرنے کے لئے، اپنی تنہائی سے بچنے کے لئے شراب کا سہارا لیتا ہے۔ اُس کا عزم یا شاید اُس کا شاندار کاروبار بھی اسے اپنے وحشت ناک خوفوں سے مہلت نہیں دلاتے اور رفتہ رفتہ اُس کے ہوش و حواس جواب دینے لگتے ہیں اور وہ اس زینے پر سے نیچے گرنے لگتا ہے۔ ایک سنگ دِل، بے پروا، مقدر سے دھکیلا ہوا جو سیدھا پاگل خانے اور مکمل ذہنی انتشار کی طرف جاتا ہے۔''[۱۱]

''گُرگِ شب'' بنیادی طور پر ایک ناولٹ ہے جس میں ناول نگار کی پوری توجہ مرکزی کردار کے بنیادی

مسئلے کی شدت اور اُس کے ردِعمل پر مرکوز رہی ہے۔ وہ چاہتے تو اس کی موجود ضخامت میں اضافہ بھی کیا جا سکتا تھا اور یہ اضافہ ایسا بے جا بھی نہ ہوتا بلکہ ناول کے بعض تشنہ پہلوؤں سے جنم لینے والے سوالات بھی پیدا نہ ہوتے۔ مثلاً شفیع کا اپنے گاؤں سے مستقل شہر سکونت اختیار کرنا اور ایک کامیاب تاجر بننا کچھ تفصیلات کا تقاضا کرتا ہے جو ناول میں سرے سے موجود نہیں ہیں۔ اِسی طرح اس کردار کی ذہنی حالت تربیت دینے والے اہم ترین کردار اُس کی ماں، باپ، بھائی یا بھابھیاں ناول میں محض اِس ذہنی حالت کے سبب کے طور پر کچھ دیر سامنے آتے ہیں لیکن پھر آخر تک اِن کرداروں کو یکسر فراموش کر دیا گیا ہے۔ اِن کرداروں کی اس گمشدگی اور ایک نفسیاتی مریض کی کامیاب تجارتی زندگی سے متعلق بہرحال کچھ وضاحتیں ناول کا حصہ بنا دی جاتیں تو ناول زیادہ وقیع ہو جاتا۔

ناول کا مرکزی کردار اپنی نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ ایک اہم سوال بھی قاری کے سامنے لاتا ہے جو دراصل مصنف کے تصورِ وقت کو ظاہر کرتا ہے۔ ناول نگار کے مطابق وقت کا جبر ہی اقدار کا تعین کرتا ہے اور انہی مروجہ اقدار سے انسانی نفسیات ترتیب پاتی ہے۔ انسان اپنی منشا کی اقدار لے کر پیدا نہیں ہوتا بلکہ اُسے اپنے سماج کی مروجہ اقدار اور نظامِ اخلاق کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار یہی سوال اُٹھاتا ہے کہ وہ آج سے ہزاروں برس پہلے یا آنے والے زمانوں میں پیدا ہوتا تو ممکن ہے اُسے اپنے موجود حیثیت پر جس ذلت سے واسطہ پڑ رہا ہے اُس کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ یوں دراصل حرامی ہونا بذاتِ خود ایک ذلت آمیز احساس نہیں بلکہ مروج نظامِ اخلاق کا رائج تصور اسے ایک ذلّت آمیز احساس میں بدل دیتا ہے۔

> ''سماجی ماحول کو (یہ کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا ہے) کوکسی ایک معاشرے کی مجموعی سوچ اور اندازِ فکر متعین کرتی ہے۔ جب یہ سوچ اور فکر پرانی ہو جاتی ہے، گھس جاتی ہے اور لوگ غیر شعوری طور پر اس کی پابندیوں سے تھک چکے ہوتے ہیں تو کوئی آ کر معاشرے کو نیا رُخ دے دیتا ہے اور مصلح کہلاتا ہے۔ مَیں اگر آج سے دس ہزار سال پہلے پیدا ہوتا تو کوئی مجھے میرے بھائی کا بیٹا کہہ کر ذلیل نہ کرتا، کوئی میری ماں کو دنیا کا ذلیل ترین گناہ کرنے کا مرتکب نہ ٹھہراتا۔۔۔۔ میں دراصل عبوری دور میں پھنس گیا ہوں۔ پرانی اقدار فرسودہ ہو چکی ہیں۔ نئی اگرچہ پیدا ہو رہی ہیں لیکن ابھی وجود میں نہیں آئیں۔ دنیا اس وقت دردِزہ میں مبتلا ہے اور شاید چند صدیوں میں نئی اقدار تولد ہو جائیں۔''
>
> [گُرگِ شب، ص۱۸۲۔۱۸۱]
>
> ''میرے بھائی نے معاف کیجئے میرے باپ نے اگر اپنی سوتیلی ماں سے مل کر مجھے پیدا کیا تو پرانے نہایت پرانے دستور کے مطابق نہ اچھا کیا نہ برا کیا، لیکن آج کے زمانے میں مجھے بدترین حرامی ہونے کی لعنت سے کیونکر چھٹکارا ملے۔ نئی اقدار ابھی پیدا نہیں ہوئیں۔ خدا کہیں گم ہے۔ میں

ابتدائے آفرینش سے اپنی ذات کے ساتھ بندھا ہوا ہوں، اِن حالات میں مجھے ناواقفیت کی دیوار کے پیچھے چلے جانا چاہیے۔'' [گُرگِ شب، ص۱۸۳]

یہ مصنف کا کا وہ تصورِ وقت ہے جو دراصل اقدار کو متعین کرتا ہے اور یوں ذلت یا برائی کوئی معروضی سچ نہیں رہتے بلکہ ایک موضوعی حقیقت بن جاتے ہیں جنہیں مروج اقدار اور نظامِ اخلاق سے توثیق لینا پڑتی ہے۔ مصنف بھی یہاں اپنی تخلیق کے زمانے سے نالاں ہے اور تب تک کے لیے ناواقفیت کی دیوار کے پیچھے چھپ جانے کا متمنی ہے جب تک کہ نئی اقدار اُس کی حیثیت کو قابلِ قبول بنا کر ان کو توثیق نہ کر دیں۔

یہیں مصنف کے لہجے کی تلخی ان کاٹ دار جملوں کو بھی وجود میں لاتی ہے جو غالباً اس ناول کی ضبطی کا سبب بنتے ہیں:

''ہمارا خدا کہاں ہے؟ وہ تو گم ہے۔ کہیں چلا گیا ہے جیسے کوئی گڈریا اپنی بھیڑوں کو جب وہ نہایت انہماک سے چرنے میں مصروف ہوں پیدل چھوڑ کے چپکے سے کہیں کھسک جائے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے خُدا وہ سوکھا سڑا بوڑھا پٹھان ہے جو اپنا پھٹا ہوا غلیظ کوٹ پہنے بچوں کے سکول کے سامنے زنگ آلود کنستر پر بیٹھا گھٹنوں پر ہوائی بندوق رکھے اپنی وحشت زدہ بھوکی نظروں سے بچوں کا منتظر ہوتا ہے کہ وہ آئیں اور سامنے لکڑی کے تختے پر لگے ہوئے پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے تن کے کھڑے انسانوں کو نشانہ بنائیں۔ اُس کی بھیڑیں بھی تو سنگلاخ پہاڑوں پر اس کے انتظار میں گھوم رہی ہوں گی اور یہ یہاں زنگ آلود کنستر پر اُداس بیٹھا ہے۔ جاؤ ان کے پاس جو تمہارے انتظار میں ہیں۔ کیوں لوہے کی سلاخ پر پروئے انسانوں پر بچوں سے چھرے چلواتے ہو جو کہیں ہل کے جا بھی نہیں سکتے اور وہیں سلاخ پر اپنے پروے ہوئے بدنوں کے اردگرد دیوانہ وار چکر کھا کر پھر نیا چھرا کھانے کے لئے رُک جانے پر مجبور ہیں۔ جاؤ۔'' [گُرگِ شب، ص۱۸۴۔۱۸۳]

لہجے کی یہ تلخی اور کاٹ دار جملے مصنف کے ترقی پسندانہ شعور کے عکاس ہیں جہاں وہ وقت کے جبر اور تقدیر کے تسلّط کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ لیکن اِس ناول کی خوبصورتی اس فکر کا وہ اظہار ہے جو مصنف کے سماجی شعور کے ساتھ ساتھ گہرے نفسیاتی شعور کو بھی اُجاگر کر رہا ہے۔ اس نوع کے موضوعات ہمیں مغربی فکشن میں تو دکھائی دیتے ہیں لیکن اُردو فکشن میں کم کم نظر آتے ہیں۔ ناول کے مطالعے سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ شاید ناول نگار نے اِس ناول کو لکھنے سے پہلے اینگلز کی وہ کتاب پڑھ رکھی ہے جو خاندان اور برادری کی تخصیص سے متعلق ہے اور جس کی رو سے عام انسان بہ حیثیت کثیر زوجگی اور ایک عورت کے کئی مردوں سے جنسی اختلاط کی وجہ سے حرامی ہیں۔ [۱۲]

آخر میں ناول کے عنوان کی توجیہہ تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ آخر کیوں ناول نگار نے ''سپن بھکاری'' کو بدل کر ''گُرگِ شب'' کا انتخاب کیا۔ عنوان کی علامتی توجیہہ ناول میں موجود ہے۔ یہ توجیہہ مرکزی کردار کے وہ خواب ہیں جو کم و بیش ہر رات اُس کی نیند پر شب خوں مارتے ہیں اور وہ خوفزدہ ہو کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ ہر

شب وہ اِن خوابوں سے نجات پانا چاہتا ہے لیکن یہ خواب رات کے بھیڑیوں کی مانند ہر رات اُسے خوفزدہ کرنے آجاتے ہیں۔ دراصل یہی وہ ''گُرگ'' ہیں جو رات کی تاریکی میں حملہ کرتے ہیں۔''

''خواب مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں جو یہ ہر رات آکر مجھے دُکھ اور خوف کے اس بھیانک جہنم میں دھکیل دیتے ہیں۔ پھر دِن بھر ان کی اذیت ناک دہشت سے لرزتا رہتا ہوں۔'' [گُرگِ شب، ص۶۴]

''یہ خواب مجھ سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ دراصل میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جو کہہ نہیں پا رہا۔۔۔ میری چھاتی کے بوجھ! میری زندگی کے بھاری پتھر! یہ جو ہر رات تم میرا گلہ گھونٹنے آجاتے ہوا ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کبھی میرے ذہن سے پھسل کر میری زبان پر آجاؤ''۔

[گُرگِ شب، ص۶۵]

ناول کی اِن نفسیاتی توجیہات کے ساتھ ساتھ اس کا سماجی مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ بالائی طبقے کی اخلاقیات اور راہ ورسم کے معیارات کا جن جزئیات کے ساتھ بیان ناول میں کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ الگ مطالعے کا متقاضی ہے۔

بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''گُرگِ شب'' اُردو کا ایسا اہم ناول ہے جسے ازسرِ نو پڑھنے اور شائع کئے جانے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اُس وقت کی آمرانہ حکومت نے اس کی ضبطی کا حکم دیا لیکن ناول اپنے موضوع اور پیشکش ہر دو سطح پر اُردو کا ایک اہم ناول ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

حواشی

۱۔ دیکھیے 'سویرا' شمارہ نمبر 52۔51۔50، ص293 تا303
۲۔ ریاض احمد، (تبصرہ) مشمولہ 'سویرا' نومبر دسمبر 2001ء، ص۱۰
۳۔ اکرام اللہ کے دو افسانوی مجموعوں (جنگل، بدلتے قالب) دو ناولوں (گُرگِ شب، سائے کی آواز) چار ناولٹس کے مجموعے (سوا نیزے پر سورج) کو پیشِ نظر رکھا جائے تو میرے بیان کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔
۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، 'اکرام اللہ اور اُس کا فن'، مشمولہ 'اہلِ قلم' ملتان دسمبر 1982ء، ص۱۸
۵۔ مجتبیٰ حسین، 'ادب میں نظریے کا استعمال' مشمولہ 'ادبِ لطیف' لاہور، جون 1952ء، ص۱۵
۶۔ احتشام حسین، 'ادب اور سماج'، کتب پبلی کیشنز، بمبئی، 1948ء ص۴۳
۷۔ ریاض احمد، (تبصرہ) 'مشمولہ، سویرا'، لاہور، نومبر دسمبر 2001ء، ص۱۰
۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اکرام اللہ اور اُس کا فن، مشمولہ 'اہلِ قلم' ملتان، ص۱۹
۹۔ محمد خالد اختر، (فلیپ)، اکرام اللہ، 'جنگل'، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1990ء
۱۰۔ اکرام اللہ، 'گرُگِ شب'، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1978ء ص۴۵
۱۱۔ محمد خالد اختر، (فلیپ) 'گرُگِ شب'
۱۲۔ تفصیل کے لیے اینگلز کی کتاب "Ancient Society" دیکھئے جسے اُردو میں ''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز'' کے عنوان سے ترجمہ کیا گیا اور فکشن ہاؤس لاہور نے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔